تدبرِ قرآن

۱

الفاتحة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا مضمون

اس سورہ میں پہلے اس جذبۂ شکر کی تعبیر ہے جو اللہ تعالیٰ کی پروردگاری، اس کی بے پایاں رحمت اور اس کائنات کے نظام میں اس کے قانونِ عدل کے مشاہدات سے ایک سلیم الفطرت انسان پر طاری ہوتا ہے یا طاری ہونا چاہیئے۔ پھر اس جذبۂ شکر سے خدا ہی کی بندگی اور اسی سے استعانت کا جو جذبہ ابھرتا ہے یا ابھرنا چاہیئے اس کو تعبیر کیا گیا ہے، پھر اس جذبہ کی تحریک سے جو مزید طلب۔ وجستجو ہدایت و رہنمائی کے لئے پیدا ہوتی ہے یا پیدا ہونی چاہیئے وہ ظاہر کی گئی ہے۔

ب۔ سورہ کا اسلوب

اس سورہ کا اسلوب دعائیہ ہے۔ لیکن اندازِ کلام مخاطب کو سکھانے کا نہیں ہے کہ وہ یوں دعا کرے بلکہ اصل دعا ہماری زبان پر طاری کر دی گئی ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ اگر ہماری فطرت سلیم ہے تو ہماری زبان سے ہمارے دل کا ترانۂ حمد یوں نکلنا چاہیئے۔ چونکہ یہ تعبیر اسی خدا کی بخشی ہوئی ہے جو ہماری فطرت کا بنانے والا ہے اس وجہ سے اس سے زیادہ سچی تعبیر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر سلیم الفطرت انسان اس کو اپنے ہی دل کی آواز سمجھتا ہے۔ صرف وہی لوگ اس سے کوئی بیگانگی محسوس کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنی فطرت بگاڑ لی ہو۔

سُورَةُ الفَاتِحَةِ (١)

مَكِّيَّةٌ —— اٰيَاتُهَا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

شروع خدائے رحمان ورحیم کے نام سے

شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے، کائنات کا رب، رحمان اور رحیم، جزا و سزا کے دن کا مالک۔ ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھے رستے کی ہدایت بخش، ان لوگوں کے رستے کی جن پر تُو نے اپنا فضل فرمایا، جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ۔

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حمد کا مفہوم

حمد: حمد کا ترجمہ عام طور پر قرآن مجید کے مترجموں نے تعریف کیا ہے، لیکن میں نے اس کا ترجمہ شکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی یہ لفظ اس ترکیب کے ساتھ استعمال ہوا ہے اُسی مفہوم کو ادا

کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے جس مفہوم کو ہم شکر کے لفظ سے ادا کرتے ہیں مثلاً وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۴۳۔ اعراف (انھوں نے کہا شکر کا سزاوار ہے اللہ جس نے ہمیں اس کی ہدایت بخشی) وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۱۰۔ یونس (اور ان کی آخری صدا یہ ہوگی کہ شکر ہے اللہ کے لئے جو عالم کا رب ہے) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۳۹۔ ابراہیم (شکر ہے اللہ کے لیے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ عطا فرمائے)۔

استعمالات کے لحاظ سے اگرچہ حمد کا لفظ شکر کے مقابل میں زیادہ وسیع ہے، شکر کا لفظ کسی کی صرف انہی خوبیوں اور انہی کمالات کے اعتراف کے موقع پر بولا جاتا ہے جن کا فیض آدمی کو خود پہنچ رہا ہو، برعکس اس کے حمد ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کے کمالات کے اعتراف کے لئے عام ہے، خواہ ان کا کوئی فیض خود حمد کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو، تاہم شکر کا مفہوم اس لفظ کا جزوِ غالب ہے۔ اس وجہ سے اس کے ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لیے یا تو تعریف کے لفظ کے ساتھ شکر کا لفظ بھی ملانا ہوگا یا صرف شکر کے لفظ سے اس کو تعبیر کرنا زیادہ مناسب رہے گا تاکہ یہ سورہ جس احساسِ شکر اور جس جذبۂ سپاس کی تعبیر ہے اس کا پورا پورا اظہار ہو سکے۔ یہ اظہار صرف تعریف کے لفظ سے اچھی طرح نہیں ہوتا۔ آدمی تعریف کسی بھی اچھی چیز کی کر سکتا ہے اگرچہ اس کی اپنی ذات سے اس کا کوئی دُور کا بھی واسطہ نہ ہو، لیکن یہ سورہ ہماری فطرت کے جس جوش کا مظہر ہے وہ جوش ابھرا ہی ہے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و رحمانیت کے ان مشاہدات سے جن کا تعلق براہ راست ہماری ذات سے ہے۔ اگر یہ اچھی طرح واضح نہ ہو سکے تو اس سورہ کی جو اصل روح ہے وہ واضح نہ ہو سکے گی۔ شکر کے لفظ سے سورہ کا یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

اللہ: اس کی وضاحت آیت بسم اللہ کے تحت ہو چکی ہے۔

رَبّ: رب کے معنی پرورش کرنے والے اور مالک و آقا کے آتے ہیں۔ یہ دوسرا مفہوم اگرچہ پہلے مفہوم ہی سے اس کے ایک لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوا ہے کیونکہ جو ذات پرورش کرنے والی ہے اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مالک اور آقا بنے۔ لیکن یہ مفہوم اس لفظ پر ایسا غالب ہو چکا ہے کہ اس سے الگ ہو کر محض پرورش کرنے والے کے لیے اس کا استعمال باقی نہیں رہا۔

رب کا مفہوم

قرآن مجید کے مخاطبِ اول کائنات کا خالق تو جیسا کہ آیت بسم اللہ کی تفسیر میں گزر چکا ہے، تنہا اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن رب انھوں نے اور بھی بنا رکھے تھے جن کی نسبت ان کا گمان تھا کہ خدا نے کائنات کے انتظام میں ان کو اپنا شریک بنا رکھا ہے، اس وجہ سے یہ عبادت و اطاعت کے حقدار ہیں۔ یہاں اللہ کے بعد اس کی پہلی ہی صفت ربّ العالمین بیان ہوئی جس سے مقصود اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ جو اللہ کائنات کا خالق ہے، وہی اس کا مالک بھی ہے کیونکہ وہی سب کی پرورش کرنے والا ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ: اللہ تعالےٰ کے ان دونوں ناموں کی وضاحت آیت بسم اللہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

لفظ 'دین' کے مطالب

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ: دین کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

۱۔ مذہب و شریعت کے معنی کے لیے مثلاً اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ ۸۳۔ آل عمران (کیا خدا کے اتارے ہوئے مذہب کے سوا وہ کسی اور مذہب کے طالب ہیں)۔

۲۔ قانونِ ملکی کے لیے مثلاً مَاكَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ ۷۶۔ یوسف (اس کو بادشاہ کے قانون کی رُو سے یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کو روک سکے)۔

۳۔ اطاعت کے معنی کے لیے مثلاً وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۵۲۔ نحل (اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی اطاعت ہمیشہ لازم ہے)

۴۔ جزا کے معنی کے لیے مثلاً اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۶۔ ذاریات (جس چیز کی تمہیں دھمکی سنائی جا رہی ہے وہ سچ ہے اور جزا و سزا واقع ہو کر رہے گی)۔

جزا سے مراد اس کے دونوں پہلو ہیں۔ نیک اعمال کا صلہ بھی اور بُرے کاموں کی سزا بھی۔ اس وجہ سے ہم نے ترجمہ میں جزا کے ساتھ سزا کا لفظ بھی بڑھا دیا ہے۔

جزا و سزا کے دن کا تنہا مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس روز سارا زور اور سارا اختیار اسی کو حاصل ہوگا۔ اس کے آگے سب عاجز و سرفگندہ ہوں گے کسی کی مجال نہ ہوگی کہ اس کی اجازت کے بغیر زبان کھول سکے۔ سارے معاملات کا فیصلہ تنہا وہی کرے گا جس کو چاہے گا سزا دے گا، جس کو چاہے گا انعام دے گا۔ جیسا کہ فرمایا ہے اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۵۶۔ حج (اس دن سارا اختیار اللہ ہی کو ہوگا، وہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا) لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۱۶۔ غافر (آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؛ صرف خدائے واحد و قہار کی)

اس آیت کے تین لفظوں میں جو بات پوشیدہ ہے وہ اگر پھیلا دی جائے تو پوری بات یوں ہوگی کہ ایک دن جزا اور سزا کا آنے والا ہے۔ اس دن سارا اختیار صرف اللہ تعالےٰ ہی کو حاصل ہوگا اور اس کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوگی۔ لیکن کلام کے دعائیہ اسلوب میں یہ بات اس طرح لپیٹ دی گئی ہے کہ دعا کرنے والا ایک ثابت شدہ حقیقت کی حیثیت سے ان سب باتوں کا اعتراف کر جاتا ہے۔ گویا خدا کی ربوبیت و رحمت اور اس کے عدل و انصاف کے ان آثار و دلائل کے بعد جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں، ایک ہٹ دھرم کے سوا کون ہے جو اس حقیقت کے کسی جزو کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر سکے؟

مفہوم عبادت

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ: عبادت کے اصلی معنی عربی لغت میں انتہائی خضوع اور انتہائی عاجزی و فروتنی کے اظہار کے ہیں۔ لیکن قرآن میں یہ لفظ اس خضوع و خشوع کی تعبیر کے لیے خاص ہو گیا ہے جو بندہ اپنے خالق و مالک کے لیے ظاہر کرتا ہے۔ پھر اطاعت کا مفہوم بھی اس لفظ کے لوازم میں داخل ہو گیا ہے کیونکہ یہ بات بالبداہت غلط معلوم ہوتی ہے کہ انسان جس ذات کو اپنے انتہائی خضوع و خشوع کا واحد مستحق سمجھے زندگی کے معاملات میں اس کی اطاعت کو لازم نہ جانے۔ چنانچہ عبادت کی اس حقیقت کو قرآن مجید نے بعض جگہ کھول بھی دیا

ہے۔ مثلاً:۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ ۝ (۲۔ زمر)

ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ تو اللہ ہی کی بندگی کرو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے۔

عبادت کے ساتھ اطاعت کا یہ تعلق اس قدر گہرا ہے کہ بعض جگہ یہ لفظ صاف صاف اطاعت کے مفہوم ہی کے لیے استعمال ہوگیا ہے مثلاً:

اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّيۡطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ (۶۰۔ یٰس)

کہ شیطان کی عبادت نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

اللہ تعالےٰ کا جو حق بندوں پر ہے اس آیت میں وہ بھی بیان ہوگیا ہے اور بندے کا جو حق خود اللہ تعالےٰ نے اپنے اوپر واجب کیا ہے وہ بھی اس میں بیان ہوگیا ہے۔ اللہ تعالےٰ کا حق بندے پر یہ ہے کہ بندہ تنہا اسی کی بندگی کرے اور اسی سے التجا کرے۔ بندے کا حق اس نے اپنے اوپر یہ بتایا ہے کہ وہ اس پر رحمت نازل کرتا ہے اور اس کی مدد فرماتا ہے۔ آیت کے پہلے ٹکڑے میں بندہ اس حق کا اقرار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا اس کے اُوپر ہے اور اس کے دوسرے ٹکڑے میں اس حق کے لئے درخواست پیش کرتا ہے جو اللہ تعالےٰ نے اپنے اوپر بندے کا بتایا ہے لیکن پیش کرنے کا انداز نہایت مؤدبانہ ہے۔ بندہ اپنے کسی حق کی طرف کوئی اشارہ کرنے کے بجائے صرف اپنی احتیاج اپنے اعتماد اور اپنی تمنا کا اظہار کر دیتا ہے کیونکہ بندے کے شایانِ شان یہی ہے کہ وہ اپنے رب سے التجا اور درخواست کرے نہ کہ اس پر اپنا کوئی حق جتائے۔ یہ اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم ہے کہ وہ بغیر کسی استحقاق کے بندے کو سب کچھ بخشتا ہے اور پھر اس فضل و کرم کو بندہ کا حق قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سورہ سے متعلق جو مشہور حدیث قدسی ہے اس میں خاص اس ٹکڑے سے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں کہ جب بندہ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ کے الفاظ پڑھتا ہے تو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ یہ ٹکڑا میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ دیا جو اس نے مانگا۔

"ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں" کے الفاظ عام ہیں، اس وجہ سے یہ طلبِ مدد خاص عبادت کے معاملہ میں بھی ہو سکتی ہے اور زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی۔ عبادت میں بندہ خدا کی مدد کا محتاج توفیق و رہنمائی اور ثبات و استقامت کے لیے ہوتا ہے کیونکہ عبادت بالخصوص جب کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں خدا کی اطاعت پر بھی مشتمل ہو ایک بڑی ہی آزمائش کی چیز ہے۔ اس میں ایسے سخت مقامات بھی آتے ہیں جہاں بڑے بڑوں کے پائے ثبات بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔

اس جملہ میں مفعول کی تقدیم نے حصر کا مضمون بھی پیدا کر دیا ہے۔ یعنی عبادت بھی صرف خدا ہی کی اور استعانت بھی تنہا اسی سے۔ اس حصر نے شرک کے تمام علائق کا یک قلم خاتمہ کر دیا کیونکہ اس اعتراف کے بعد بندہ کے پاس کسی غیر اللہ کو نہ کچھ دینے کو رہا اور نہ اس سے کچھ مانگنے کی گنجائش باقی رہی۔ اس کے بعد دوسروں سے بندے کے

تعلق کی صرف وہی نوعیت جائز رہ گئی ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے ہی قائم کر دی ہو۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ : اِهْدِنَا کا مطلب صرف اسی قدر نہیں ہے کہ ہمیں سیدھا رستہ دکھا دے بلکہ اس کا مفہوم اس سے بہت زیادہ ہے۔ اس میں یہ مفہوم بھی ہے کہ اس راستہ کی صحت پر ہمارے دل مطمئن کر دے، اس پر چلنے کا ہمارے اندر ذوق و شوق پیدا کر دے، اس کی مشکلیں ہمارے لیے آسان کر دے اور اس پر چلا دینے کے بعد دوسری پگڈنڈیوں پر بھٹکنے سے ہمیں محفوظ رکھ۔ یہ سارا مضمون یہاں صلہ کو حذف کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔

"الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" پر الف لام عہد کا ہے۔ اس سے مراد وہ سیدھا رستہ ہے جو بندوں کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے کھولا ہے، جو دین اور دنیا دونوں کی فلاح و کامیابی کا ضامن ہے، جس پر چلنے کی دعوت نبیوں اور رسولوں نے دی ہے، جس پر ہمیشہ خدا کے نیک بندے چلے ہیں، جو قریب تر اور سہل تر ہے، جس کے اِدھر اُدھر سے گمراہوں اور گمراہ کرنے والوں نے بہت سی کج پیچ کی راہیں نکال لی ہیں، لیکن وہ بجائے خود قائم ہے اور خدا تک پہنچنے والے ہمیشہ اسی پر چل کر خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسی سیدھے رستہ کو حضورؐ نے ایک مرتبہ اس طرح سمجھایا کہ زمین پر ایک سیدھا خط کھینچا، پھر اس کے داہنے بائیں آڑے ترچھے خطوط کھینچ دیئے، پھر فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا رستہ ہے اور یہ آڑے ترچھے خطوط پگڈنڈیاں ہیں اور ان میں سے ہر پگڈنڈی کی طرف کوئی نہ کوئی شیطان بلا رہا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ الآية: آدمی جس چیز سے جتنا ہی گہرا لگاؤ رکھتا ہے اس کو اسی قدر وضاحت کے ساتھ خود بھی سمجھنا چاہتا ہے اور دوسرے کو بھی سمجھانا چاہتا ہے۔ اس وجہ سے صرف اتنے ہی پر بس نہیں کیا کہ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش بلکہ اس کی پوری وضاحت بھی کر دی ہے اور یہ وضاحت مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے ہے۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ رستہ ان لوگوں کا ہو جن پر تیرا انعام ہوا ہے اور منفی پہلو یہ ہے کہ جو نہ تو مغضوب ہوئے ہیں اور نہ گمراہ۔ اس وضاحت کے بعد مدعا اس طرح آئینہ ہو کر سامنے آگیا ہے کہ کسی اشتباہ کی تو کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

اس ساری وضاحت کی ضرورت اس وجہ سے نہیں تھی کہ (العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو دعا کا مدعا سمجھنے میں کوئی غلط فہمی پیش آنے کا امکان تھا، بلکہ صرف یہ ہے کہ طالب اپنے مطلوب حقیقی کی طلب کے ساتھ ساتھ ان لوگوں سے اپنی بیزاری کا اظہار بھی کر رہا ہے جنھوں نے اس محبوب و مطلوب سے منہ موڑا یا اس سے بھٹک گئے نیز اپنے لیے استقامت و استواری کا بھی طلب گار ہے کہ اس راستہ کو پا جانے کے بعد اس پر قائم رہنا نصیب ہو، ان لوگوں کا حشر نہ ہو جن کو یہ رستہ ملنے کو تو ملا لیکن وہ اس کو پا لینے کے بعد یا تو دیدہ و دانستہ اس سے منحرف ہو جانے کے سبب سے خدا کے غضب میں مبتلا ہوئے، یا اپنی بدعت پسندیوں کی وجہ سے اس کو پا کر اس سے محروم ہو گئے۔

اس آیت میں تین گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک منعم علیہم۔ دوسرا مغضوب علیہم۔ تیسرا ضالین۔ مختصراً ان تینوں گروہوں کی خصوصیات بھی معلوم کر لینی چاہئیں۔

منعم علیہم کون ہیں؟

"اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" میں نعمت سے مقصود دراصل ہدایت و شریعت کی نعمت ہے جس سے انسان دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کا رستہ معلوم کرتا ہے۔ فعل انعام یہاں اپنے کامل اور حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد در حقیقت وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالٰے نے شریعت کی نعمت عطا فرمائی اور انھوں نے دل و جان سے اس کو قبول کیا، اس نعمت کے دیئے جانے پر وہ اللہ تعالٰے کے شکر گزار رہے، اس کی خود بھی قدر کی اور دوسروں کو بھی اس کی قدر کرنے پر ابھارا، اس کے تحفظ کے لیے انھوں نے اپنی قوتیں اور قابلیتیں بھی صرف کیں، مال بھی قربان کئے اور اگر ضرورت پیش آئی تو اس کی راہ میں جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ کہی گئی ہے اس وجہ سے واضح نہیں ہوتا کہ یہ اشارہ کس گروہ کی طرف ہے لیکن ایک دوسری آیت میں اس انعام یافتہ گروہ کی وضاحت ہو گئی ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ	پس یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے
مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ	اپنا انعام فرمایا انبیاء، صدیقین، شہداء اور
وَالصّٰلِحِيْنَ ۶۹ - نساء	صالحین کے ساتھ۔

"مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح براہِ راست نہیں ہے جس طرح انعام کے ذکر میں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو سُوءِ ادب سے احتراز ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انعام ہمیشہ اور ہر حال میں بندہ پر اللہ تعالٰے ہی کی طرف سے ہوتا ہے، برعکس اس کے خدا کے غضب کا مستحق بندہ اپنے اعمال کے سبب سے خود بنتا ہے۔

مغضوب علیہم سے مراد

مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن پر اللہ تعالٰے نے اپنی شریعت کی نعمت نازل فرمائی لیکن انھوں نے اپنی سرکشی کے سبب سے نہ صرف یہ کہ اس کو قبول نہیں کیا، بلکہ اس کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور جن لوگوں نے اس کو ان کے سامنے پیش کیا ان کی بیخ کنی اور قتل کے درپے ہوئے جس کی پاداش میں ان پر خدا کا غضب نازل ہوا اور وہ ہلاک کر دیے گئے۔

دوسرے وہ لوگ جنھوں نے قبول تو کیا لیکن دل کی آمادگی کے ساتھ نہیں قبول کیا بلکہ مارے باندھے قبول کیا، پھر بہت جلد شہواتِ نفس میں پڑ کر انھوں نے اس کے کچھ حصّہ کو ضائع کر دیا، کچھ حصّہ میں کتر بیونت کر کے اس کو اپنی خواہشات کے مطابق بنا لیا اور جن لوگوں نے ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی یا ان کو صحیح راستہ پر لانا چاہا انھوں نے ان میں سے بعض کو جھٹلا دیا اور بعض کو قتل کر دیا۔ پچھلی اُمتوں میں اس کی سب سے واضح مثال یہود ہیں، چنانچہ ان کے معتوب و مغضوب ہونے کا ذکر قرآن میں تصریح کے ساتھ ہوا بھی ہے۔ مثلاً

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ	جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر اس کا غضب ہوا۔
مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ (۶۰ - مائدہ)	اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور خنزیر بنائے۔
وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ	اور ان کے اوپر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ
وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۶۱ - بقرہ)	خدا کا غضب لے کر پلٹے۔

ضَآلِّیۡن سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دین میں غلو کیا، جنھوں نے اپنے پیغمبر کا رتبہ اتنا بڑھایا کہ اس کو خدا بنا کر رکھ دیا، جو صرف انھی عبادتوں اور طاعتوں پر قانع نہیں ہوئے جو اللہ اور اللہ کے رسُول نے مقرر کی تھیں بلکہ اپنے جی سے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا، جنھوں نے اپنے اگلوں کی ایجاد کی ہوئی بدعتوں اور گمراہیوں کی آنکھ بند کر کے پیروی کی اور اس طرح صراطِ مستقیم سے ہٹ کر گمراہی کی پگڈنڈیوں پر نکل گئے۔ پچھلی اُمتوں میں سے اس کی نہایت واضح مثال نصاریٰ ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے انھی وجوہ کی بنا پر جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، ان کو گمراہ اور گمراہ کرنے والے قرار دیا ہے۔ مثلاً

ضالین کی حقیقت

يَاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ غَيۡرَ الۡحَـقِّ وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَهۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَاَضَلُّوۡا كَثِيۡرًا وَّضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ (۷۷ - مائدہ)

کہہ دو اے اہلِ کتاب تم اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشوں (بدعتوں) کی پیروی نہ کرو جو پہلے سے گمراہ چلے آرہے ہیں اور جنھوں نے بہتوں کو خدا کے رستہ سے بھٹکایا اور جو خود بھی اس کے رستہ سے بھٹکے۔

۲- سورہ کا استدلالی پہلو

توحید اور آخرت کے دلائل

یہ سورہ چونکہ دعا کے اسلوب میں ہے اس وجہ سے اس میں استدلال کا پہلو واضح نہیں ہے لیکن اس میں جن باتوں کا بندے کی طرف سے اقرار اور پھر جس بات کی درخواست ہے، ان میں سے ہر چیز نہایت مضبوط عقلی اور فطری دلائل پر قائم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک دعا تو ہماری زبان سے کہلا دی گئی ہو، جس کے اندر ہماری طرف سے نہایت اہم اعترافات بھی موجود ہوں لیکن نہ تو ان اعترافات ہی کے لئے کوئی عقلی بنیاد ہو اور نہ اس درخواست ہی کے لیے ۔۔۔

اس دعا کے اندر استدلال کے جو پہلو ہیں یہاں ہم اختصار کے ساتھ ان کو واضح کرتے ہیں۔

اس میں سب سے پہلے اس امر کا اقرار ہے کہ شکر کا حقیقی سزاوار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس اقرار کی بنیاد خدا کی پروردگاری، اس کی رحمانیت، اس کی رحیمیت اور اس کے عدل کی ان نشانیوں کے مشاہدہ پر ہے جو ہمارے اندر بھی موجود ہیں اور جو اس کائنات کے بھی ہر گوشہ میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی کا بچہ ہو یا کسی حقیر سے حقیر حیوان کا، ابھی وہ دنیا میں قدم بھی نہیں رکھتا ہے کہ اس کی پرورش کا سامان پہلے سے بالکل تیار موجود ہوتا ہے۔ اس سامانِ پرورش کی تیاری کا عالم یہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس کائنات کے تمام چھوٹے بڑے عناصر رات دن اسی کی فراہمی اور اسی کے اہتمام میں سرگرم ہیں۔ سورج بھی اسی کے لیے سرگرم ہے، چاند بھی اسی کے لیے مصروفِ کار ہے، ابر بھی اسی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے اور ہوا بھی ہر آن اسی کے لیے گردش میں ہے۔

پھر پرورش اور تربیت کا یہ اہتمام ہماری زندگی کے کسی ایک ہی گوشہ میں نہیں پایا جا رہا ہے، بلکہ غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ یہ زندگی کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔ ہمارے ظاہر کی بھی پرورش ہو رہی ہے، ہمارا باطن بھی زیرِ تربیت

ہے، ہمارا جسم بھی پل رہا ہے، ہماری عقل کو بھی غذا مل رہی ہے، ہماری جسمانی قوتیں اور قابلیتیں بھی پروان چڑھ رہی ہیں اور ہماری روحانی صلاحیتوں کو بھی بالیدگی حاصل ہو رہی ہے۔ غرض ہماری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو نظر انداز ہو رہا ہو۔

اس تمام اہتمام و انتظام سے پرورش کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے؟ کیا وہ اپنی سلطنت کے قیام و بقا کے لیے ہمارا محتاج ہے کہ وہ اس فیاضی کے ساتھ ہمارے اوپر خرچ کرے؟ کیا جس طرح بھیڑوں کے کسی گلّے کا مالک یہ چاہتا ہے کہ اس کی بھیڑیں فربہ رہیں تاکہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ نفع کما سکے اسی طرح کی کوئی غرض اس جہان کے رب کے سامنے بھی ہے جس کے لیے وہ ہمیں کھلا پلا اور ہماری دیکھ بھال کر رہا ہے؟

انسان جب ان سوالوں پر غور کرتا ہے تو اسے صاف نظر آتا ہے کہ اس طرح کی کسی غرض کا کوئی ادنیٰ شائبہ یہاں دور دور تک فرض بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جس ذات کی قدرت و حکمت کا ادنیٰ کرشمہ یہ آسمان و زمین ہیں وہ بھلا ہم جیسے حقیر بھنگوں کی محتاج کیا ہو سکتی ہے؛ اچھا، اگر یہ نہیں ہے تو کیا اس کائنات کے خالق و مالک پر ہمارا کوئی حق ہے، جو پہلے سے قائم ہے اور جس کے سبب سے وہ مجبور ہے کہ ہمارے لیے یہ کچھ اہتمام وہ کرے؛ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوئی چیز بھی فرض نہیں کی جا سکتی۔ جن کو وجود کی نعمت ملی ہی محض اس کے لطف و کرم کی بدولت ہو وہ بھلا اس پر اپنا کوئی حق قائم کرنے کے قابل کس طرح ہو سکتے ہیں؛ اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے اور صاف ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو اس کی اس تمام پروردگاری کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ رحمان اور رحیم ہے۔ یہ اس کی رحمانیت کا جوش ہے کہ اس نے ہم کو وجود بخشا اور یہ اس کی رحیمیت کا فیض ہے کہ وہ برابر ہماری دیکھ بھال کر رہا ہے۔

انسان جب خدا کی پروردگاری کے اس اہتمام کو دیکھتا ہے تو یہیں سے اس پر علم و معرفت کا ایک اور دروازہ کھلتا ہے۔ یہ دروازہ ایک روزِ جزا و سزا کی آمد کا دروازہ ہے جس دن تنہا وہی پورے اختیار کے ساتھ انصاف کی کرسی پر بیٹھے گا، اور نافرمانوں کو ان کی نافرمانیوں کی انصاف کے ساتھ سزا دے گا اور نیکوں کو ان کی نیکیوں کا فضل و رحمت کے ساتھ صلہ دے گا۔

خدا کی پروردگاری اور اس کی رحمانیت اور رحیمیت کی نشانیاں ایک روزِ جزا و سزا کی آمد کو کس طرح لازم کرتی ہیں؟ اس سوال کا جواب تھوڑی سی وضاحت کا طالب ہے۔

خدا کی پروردگاری سے روزِ جزا پر استدلال قرآن مجید نے جگہ جگہ اس طرح کیا ہے کہ جس خدا نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، اور آسمان کا شامیانہ تانا، جس نے تمہارے لیے سورج اور چاند چمکائے، جس نے ابر و ہوا جیسی چیزوں کو تمہاری خدمت میں لگایا، جس نے تمہارے تمام ظاہری اور باطنی، روحانی اور مادی مطالبات کا بہتر سے بہتر جواب مہیا کیا، کیا اس خدا کے متعلق تم یہ گمان کرتے ہو کہ بس اس نے تمہیں یوں ہی پیدا کر دیا ہے اور پیدا کر کے بس یوں ہی چھوڑ دے گا، یہ تمام کارخانہ محض کسی کھلنڈرے کا ایک کھیل ہے جس کے پیچھے کوئی غایت و مقصد نہیں ہے؟ تم ایک شترِ بے مہار

کی طرح اس سرسبز و شاداب چراگاہ میں بس چرنے کے لیے چھوڑ دیئے گئے ہو، نہ تم پر کوئی ذمہ داری ہے اور نہ تم سے کوئی پرسش ہوگی ؟ اگر تم نے یہ سمجھ رکھا ہے تو نہایت غلط سمجھ رکھا ہے۔ پرورش کا یہ سارا اہتمام پکار پکار کر شہادت دے رہا ہے کہ یہ اہتمام کسی اہم غایت و مقصد کے لیے ہے اور یہ ان لوگوں پر نہایت بھاری ذمہ داریاں عائد کرتا ہے جو بغیر کسی استحقاق کے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایک دن ان ذمہ داریوں کی بابت ایک ایک شخص سے پرسش ہوگی اور وہی دن فیصلہ کا ہوگا۔ جنھوں نے اپنی ذمہ داریاں ادا کی ہوں گی وہ سُرخ رُو اور فائز المرام ہوں گے اور جنھوں نے ان کو نظر انداز کیا ہوگا وہ ذلیل اور نامراد ہوں گے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے لیکن اختصار کے خیال سے صرف ایک مثال نقل کرتے ہیں:۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا ۝ وَالْجِبَالَ	کیا ہم نے زمین کو تمہارے لیے گہوارہ نہیں بنایا اور اس
أَوْتَادًا ۝ وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا ۝ وَجَعَلْنَا	میں پہاڑوں کی میخیں نہیں ٹھونکیں ؟ اور ہم نے تم کو
نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۝	جوڑا جوڑا پیدا کیا۔ اور تمہاری نیند کو دافع کلفت بنایا۔
وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ	رات کو تمہارے لیے پردہ پوش بنایا اور دن کو حصول
سَبْعًا شِدَادًا ۝ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا	معاش کا وقت ٹھہرایا اور ہم نے تمہارے اوپر سات
وَهَّاجًا ۝ وَأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً	مضبوط آسمان بلند کیے اور روشن چراغ بنایا اور ہم نے
ثَجَّاجًا ۝ لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۝	بدلیوں سے دھڑا دھڑ پانی برسایا تاکہ اس سے ہم
وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ۝ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ	غلے اور نباتات اگائیں اور گھنے باغ پیدا کریں۔ بے شک
كَانَ مِيقَاتًا ۝ (نبا۔ ۶-۱۷)	فیصلہ کا دن مقرر ہے۔

"بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے" یعنی اوپر جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ جس نے یہ کچھ اہتمام انسان کے لیے کیا ہے وہ انسانوں کو یوں ہی شتر بے مہار کی طرح چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ اس کی نیکی یا بدی کے فیصلہ کے لیے فیصلہ کا ایک دن بھی لائے گا۔

اسی طرح اللہ تعالےٰ نے اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ قرار دیا ہے کہ ایک ایسا دن وہ لائے جس میں اچھوں اور بُروں کے درمیان انصاف کرے۔ نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ دے، اور بدکاروں کو ان کی برائیوں کی سزا دے۔ ایک رحمان اور رحیم ہستی کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ظالم اور مظلوم، نیکوکار اور بد، باغی اور وفادار دونوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کرے۔ ان کے درمیان ان کے اعمال کی بنا پر کوئی فرق نہ کرے۔ نہ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا دے نہ مظلوم کی مظلومیت کا ظالم سے انتقام لے۔ اگر زندگی کا یہ کارخانہ اسی طرح ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد جزا و سزا اور انعام و انتقام کا کوئی دن آتا نہیں ہے تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ العیاذ باللہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی نگاہوں میں متقی اور مجرم دونوں برابر ہیں بلکہ مجرم نسبتاً اچھے ہیں جن کو جرم کرنے اور فساد برپا کرنے کے لیے اس نے بالکل آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ یہ چیز بداہتہً غلط اور اس کے رحمان و رحیم ہونے کے بالکل منافی ہے چنانچہ اس نے نہایت واضح الفاظ

میں اس کی تردید فرمائی۔ مثلاً :

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۞ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۞ (۳۶۔ قلم)	کیا ہم اطاعت کرنے والوں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟

اور اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ بتایا ہے کہ ایک دن وہ سب کو جمع کرکے انصاف کرے گا اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے :

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۔ (۱۲۔ انعام)	اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کرلی ہے وہ قیامت تک جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے، تم کو ضرور جمع کرکے رہے گا۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ قیامت دراصل خدا کی رحمت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے اس وجہ سے وہ فیصلہ کا ایک دن ضرور لائے گا جس میں وہ سب کو اکٹھا کرکے ان کے درمیان انصاف فرمائے گا۔ اور یہ بھی عین اس کی اس رحمت ہی کا تقاضا ہے کہ اس دن کسی کی مجال نہ ہوگی کہ اس کے فیصلوں میں کوئی مداخلت کرسکے اور اپنی سفارشوں سے حق کو باطل یا باطل کو حق بنا سکے بلکہ ہر ایک کے لیے بالکل بے لاگ اور پورا پورا انصاف ہوگا۔

اس سے یہ نکتہ بھی واضح ہوا کہ عدل اور رحمت میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ عدل عین رحمت ہی کا تقاضا ہے۔

جذبۂ شکر دین کی بنیاد ہے

ربوبیت، رحمت اور عدل کی ان نشانیوں کے مشاہدہ سے اللہ تعالیٰ کے لیے شکر کا جو بے پایاں جذبہ پیدا ہوتا ہے یہی جذبہ ہے جو بندہ کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرے اور اپنی ہر مشکل میں اسی سے مدد مانگے۔ غور کیجیے تو صاف واضح ہوگا کہ جس طرح یہ جذبہ رحمت و ربوبیت کی نشانیوں کے مشاہدہ کا ایک فطری نتیجہ ہے اسی طرح اس جذبہ سے سرشار ہو کر بندہ کا خدا کی طرف اس کی عبادت کے لیے بڑھنا بھی اس جذبہ کا ایک بالکل فطری نتیجہ ہے۔ انسان کا ہر جذبہ اپنا ایک قدرتی ردِ عمل رکھتا ہے۔ اس جذبہ کا، جو اپنے منعم حقیقی کی شکر گزاری کے لیے انسان کے اندر ابھرتا ہے، قدرتی ردِ عمل یہ ہے کہ وہ اسی کی بندگی کرے اور اسی سے مدد مانگے۔ جو ذات اس فیاضی اور اس اہتمام کے ساتھ پرورش کر رہی ہے، جس کی یہ پروردگاری نہ اس کی طرف سے کسی غرض پر مبنی ہے اور نہ ہماری طرف سے کسی استحقاق پر بلکہ تمام تر اس کی رحمانیت اور رحیمیت کا فیضانِ عام ہے، پھر جس کی ربوبیت اور رحمانیت صرف اسی حیاتِ چند روزہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس زندگی کے بعد بھی اپنے نیک بندوں کے لیے اس نے ابدی زندگی کی سرمدی محفوظ کر رکھی ہیں، اس کے سوا کون ہے جو انسان کی حقیقی شکر گزاری کا مستحق ہوسکے۔ اور اگر وہی ہمارے حقیقی شکر کا سزاوار ہے تو پھر اس کے سوا کون ہے جو اس بات کا حقدار ہو سکتا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں اور اس سے مدد مانگیں؟

اس طرح شکر کا جذبہ گویا دھکیل کر بندے کو اس کے منعم حقیقی کے دروازے پر ڈال دیتا ہے کہ وہ اسی کی بندگی کرے اور اسی سے طالبِ مدد ہو۔ اس حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی تعبیر کرسکتے ہیں کہ درحقیقت شکر کے جذبہ سے بندہ کے اندر خدا کی عبادت کا داعیہ ابھرتا ہے اور پھر اسی جذبہ اور اسی کے قدرتی ردِ عمل سے دین کی داغ بیل پڑتی ہے۔

اس کائنات میں اور خود اپنے وجود کے اندر خدا کی ربوبیت اور اس کی رحمت کے بے شمار آثار دیکھ کر انسان کے اندر اپنے مُنعم حقیقی کے لیے شکر کا جذبہ اور اس جذبہ کی تحریک سے انسان کے اندر اس کی عبادت کرنے کا ولولہ پیدا ہونا ایک ایسی بات ہے جو ہر پہلو سے بالکل ایک فطری اور بدیہی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس حقیقت کا انکار کر سکے۔

جذبہ خوف کو دین کی بنیاد قرار دینے کی لغویت

لیکن مذہب دشمنی کے اندھے جوش میں فلسفۂ جدید کے مدعیوں نے دین کے آغاز سے متعلق اس سے بالکل مختلف نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر سب سے قدیم اور ابتدائی جذبہ خوف کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ ان ہولناک اور خوفناک حوادث کے مشاہدہ سے پیدا ہوا جو اس دنیا میں طوفانوں، زلزلوں اور وباؤں کی صورت میں آئے دن پیش آتے رہتے تھے۔ اس خوف کے جذبہ نے انسان کو اُن اَن دیکھی طاقتوں کی پرستش پر مجبور کیا جن کو اس نے ان حوادث کا پیدا کرنے والا خیال کیا۔ اور اس طرح انسان نے شرک سے دین کا آغاز کیا۔

ہم اس غلط نظریہ کی تردید اپنی ایک دوسری کتاب[1] میں پوری تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ یہاں ہم صرف اس بات پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ مذہب کے آغاز سے متعلق قرآن کی یہ تقریر زیادہ دل نشین اور عقل و فطرت کے مطابق ہے یا فلسفۂ جدید کا یہ نظریہ زیادہ قرینِ عقل و فطرت ہے؟ اس دنیا کے عام واقعات زلزلے، طوفان اور سیلاب ہی ہیں یا اس میں بہاریں بھی آتی ہیں، چاندنی بھی پھیلتی ہے، بارشیں بھی ہوتی ہیں، تارے بھی چھٹکتے ہیں، پھول بھی کھلتے ہیں اور فصلیں بھی پکتی ہیں۔ ہمارے عام مشاہدے میں زیادہ تر ربوبیت کی یہ برکتیں اور رحمت کی یہ شانیں آتی رہتی ہیں یا صرف زلزلوں اور طوفانوں کی ہولناکیاں ہی آتی ہیں؟ اس کائنات اور خود اپنی فطرت کے عجائب پر نگاہ ڈالنے کے بعد انسان پر ان دیکھی طاقتوں کا ہول طاری ہوتا ہے یا ایک رحمان و رحیم اور منعم و دیّان خدا کے احسانات کے احساس سے دل کا ریشہ ریشہ لبریز ہو جاتا ہے؟ جو شخص بھی ان سوالوں پر ضد اور ہٹ دھرمی سے پاک ہو کر غور کرے گا اور بے کم و کاست اپنے سچے تاثر کا اظہار کرے گا وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسانی عقل اور انسانی فطرت کے بہاؤ کا اصلی رخ وہی ہے جس کا پتہ قرآن مجید دے رہا ہے، نہ کہ وہ جس کی طرف فلسفۂ جدید لیے جا رہا ہے۔

یہ نظریہ بھی بدیہی طور پر غلط معلوم ہوتا ہے کہ خوف کا جذبہ تمام دوسرے جذبات سے مقدم ہے۔ خوف کا تجزیہ کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ خوف نام ہے اس چیز کا کہ آپ کو کسی ایسی چیز کے چھن جانے یا اس سے محروم ہو جانے کا اندیشہ یا خطرہ پیدا ہو گیا ہے جو آپ کو حاصل بھی ہے اور جو عزیز بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر خوف سے پہلے کسی نعمت کا شعور لازمی چیز ہے اور جب نعمت کا شعور پایا گیا تو ایک منعم کا شعور بھی لازمی ہوا اور پھر اس کی شکرگزاری کا جذبہ پیدا ہونا بھی ناگزیر ہوا۔ انسان کے مشاہدۂ کائنات اور مشاہدۂ انفس کی فطری راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ نعمتوں اور رحمتوں کے مشاہدہ سے اس پر ایک منعم حقیقی کی شکرگزاری کا جذبہ اور احساس طاری ہوا اور پھر اس جذبۂ

---

[1] ملاحظہ ہو ہماری کتاب "حقیقت شرک و توحید" حصہ دوم

کی تحریک سے وہ اس کی بندگی کی طرف مائل ہوا۔ رہا یہ سوال کہ اس صحیح شاہراہ پر ایک مرتبہ پڑ جانے کے بعد وہ دوسری غلط راہوں کی طرف کس طرح مڑ گیا تو اس کا سبب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کی فطرت میں کوئی خرابی موجود تھی جو اس گمراہی کا سبب بنی، بلکہ اس میں یا تو اختیار و ارادہ کے سوءِ استعمال کو دخل ہے یا عقل کی کج روی اور ہوا پرستی کو۔ اس مسئلہ پر بھی مفصل بحث ہم دوسری جگہ کر چکے ہیں[1]۔

اقرارِ بندگی اور اظہارِ اعتماد و توکل کے اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا ہمارے سامنے آتی ہے اور اسی دُعا پر جو اس تمام تمہید کے بعد اصلی حرفِ مدعا کی حیثیت رکھتی ہے، یہ سورہ ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد مغضوبوں اور گمراہوں کی روش سے اظہارِ بیزاری کا جو مضمون ہے وہ منفی پہلو سے اس دعا کی توضیح مزید ہے۔

۳۔ رسالت کی ضرورت پر ایک دلیل

اوپر کی ساری تمہید کا اقرار و اعتراف کی شکل میں نمایاں ہونا اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا دعا کی شکل میں سامنے آنا ایک خاص حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت کی نشانیوں کا تعلق ہے، جہاں تک ان نشانیوں کے مشاہدہ سے شکر کے جذبہ کے ابھرنے کا تعلق ہے اور پھر اس جذبۂ شکر کی تحریک سے جہاں تک اسی منعمِ حقیقی کی بندگی اور اسی سے طلبِ اعانت کے ارادہ کا تعلق ہے، یہ باتیں ایسی کھلی ہوئی ہیں کہ ان کو ہر انسان محسوس کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے دل پر پردہ نہ پڑا ہوا ہو۔ اگر انسان اپنی عقل اور اپنی فطرت کو ان کی اپنی روش پر کام کرنے دے، غیر فطری اڑنگے ان کی راہ میں نہ ڈالے تو وہ ان باتوں میں سے کسی بات کے اقرار و اعتراف میں بھی بخل نہیں کرے گا، یہاں تک کہ ایک روزِ جزا کی آمد میں بھی اس کو شبہ نہیں ہوگا۔ البتہ اگر وہ رکے گا تو اس مقام پر آکر رکے گا کہ جس خدا کی وہ بندگی کرنا چاہتا ہے اور اپنی ہر مشکل میں جس کی مدد پر اس نے بھروسہ کیا ہے اس تک پہنچنے کا، اس کی عبادت کرنے کا، اس کی پسند اور ناپسند معلوم کرنے کا اور زندگی کی ہر مشکل میں اس سے مدد مانگنے کا صحیح طریقہ اور سیدھا رستہ کیا ہے؟ اسی صحیح رستہ کو معلوم کرنے کے لیے بندہ اللہ تعالیٰ سے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا کرتا ہے۔

اس بات کو صریح دعا کے اسلوب میں کہنے کے معنی یہ ہیں کہ یہاں انسان کی اپنی عقل اور سمجھ بالکل عاجز ہے۔ صرف خدا ہی ہے جو بتا سکتا ہے کہ صراطِ مستقیم کیا ہے اور وہی ہے جو اس صراطِ مستقیم کو اختیار کر لینے کے بعد اس پر جمے رہنے کی توفیق بخش سکتا ہے۔ یہیں سے انسانی فطرت کے اندر وہ خلا نمایاں ہوتا ہے جس کے سبب سے وہ نبوت اور رسالت کا محتاج ہوتا ہے۔ انسان اگر کج فہمی سے کام نہ لے تو آفاق اور انفس کی نشانیوں سے وہ یہ تو معلوم کر سکتا ہے کہ ایک خدا ہے، وہ پرورش کرنے والا اور مہربان ہے اور وہ جزا اور سزا دینے والا بھی ہے، لیکن یہ معلوم کرنا اس کے بس میں نہیں ہے کہ اس خدا کی بندگی اور اطاعت کا طریقہ کیا ہے۔ یہی طریقہ بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو ہماری کتاب 'حقیقت شرک و توحید'۔

۴۔ سورہ پر دعا کے پہلو سے ایک نظر

دعا کے پہلو سے اس سورہ کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے تنہا یہی بات کافی ہے کہ یہ سورہ ہماری سب سے بڑی عبادت ۔ نماز ۔ کی خاص سورہ ہے ۔ صحیحین کی مشہور روایت ہے کہ لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب اس شخص کی نماز نہیں ہے جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔

سورہ کی تاثیر

پھر اپنی تاثیر کے لحاظ سے اس کا جو درجہ ہے اس کا اندازہ اس حدیث قدسی سے ہوتا ہے جو مسلم میں موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ جب پورے شعور اور اخلاص کے ساتھ نماز میں اس سورہ کی تلاوت کرتا ہے تو اس کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے ساتھ ہی خدا کے ہاں شرفِ قبولیت پاتا ہے ۔ حدیث ملاحظہ ہو :۔

عن ابی ھریرۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللہ تعالیٰ قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین فنصفھا لی ونصفھا لعبدی ولعبدی ماسأل اذا قال العبد الحمد للہ رب العلمین قال اللہ حمدنی عبدی واذا قال الرحمن الرحیم قال اللہ اثنی علی عبدی واذا قال ملٰک یوم الدین قال مجدنی عبدی واذا قال ایاک نعبد وایاک نستعین قال ھذا بینی وبین عبدی ولعبدی ماسأل فاذا قال اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین قال ھذا لعبدی ولعبدی ماسأل۔	ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندہ کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کا نصف حصہ میرے لیے ہے اور نصف میرے بندہ کے لیے ہے اور میرے بندہ کو وہ بخشا گیا جو اس نے مانگا جب بندہ الحمد للہ رب العالمین کہتا ہے ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میرا شکریہ ادا کیا اور جب وہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہے ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف بیان کی ہے اور جب وہ مالک یوم الدین کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بڑائی بیان کی اور جب بندہ ایاک نعبد و ایاک نستعین کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ بخشا جو اس نے مانگا ۔ پھر جب بندہ اہدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ بخشا جو اس نے مانگا۔

اس حدیث میں اس سورہ کا جو حقیقت افروز اور معنی خیز تجزیہ ہے وہ بجائے خود اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی

بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس کے اس پہلو پر ہم غور کرنا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس نے اس کے لفظ لفظ کے اندر یہ تاثیر بھر دی ہے کہ بندے کی زبان سے لفظ ابھی نکلا نہیں کہ بارگاہِ رب العزت سے اس کی سندِ قبولیت اس کو عطا ہو گئی۔ دعائیں اور بھی ایک سے ایک بڑھ کر ہیں لیکن شاید ہی کسی دعا کے متعلق اس تفصیل سے بتایا گیا ہو کہ اس کے ایک ایک لفظ کا خود اس ذات پر کیا اثر پڑتا ہے جس سے یہ دعا کی جاتی ہے اور کن لفظوں میں وہ اس کو قبول فرماتا ہے۔

دعا کی خوبیاں

اس دعا کی اس غیر معمولی اہمیت اور عظمت کے سبب سے ہم چاہتے ہیں کہ اس کی بعض خوبیاں ہم یہاں واضح کریں، اگرچہ توقع نہیں کہ اس کی خوبیوں اور بلاغتوں کا عشرِ عشیر بھی ہم بیان کرنے پر قادر ہو سکیں۔

اس دعا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جس چیز کے لیے دعا کی گئی ہے اس سے اعلٰے اور اس سے برتر کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں بندہ خدا سے خود اسی تک پہنچنے اور اسی کو پانے کے سیدھے رستہ کی ہدایت مانگتا ہے۔ یہ دعا اوّل تو ہر شائبۂ نفس سے پاک ہے۔ ثانیاً یہ عین اس مقصد کے لیے دعا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ ثالثاً یہ ایک ایسے معاملہ میں خدا سے رہنمائی کی دعا ہے جس میں انسان کی اپنی عقل، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے، بالکل عاجز و درماندہ ہے۔ صرف خدا ہی کی رہنمائی سے وہ اسے پا بھی سکتا ہے اور اسی کی توفیق سے اسے پا کر اس پر قائم بھی رہ سکتا ہے۔ ان وجوہ سے جب بندہ یہ چیز اپنے رب سے مانگتا ہے تو ایک ایسی چیز مانگتا ہے جو فی الحقیقت مانگنے کی بھی ہے اور تنہا اسی سے مانگنے کی ہے۔

دوسری چیز اس دعا کی تمہید ہے جو ہر پہلو سے ایک ایسی تمہید ہے جس سے بہتر تمہید کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کریم کے دروازے سے سائل کو سب کچھ مل سکتا ہے بشرطیکہ مانگنے کا طریقہ صحیح ہو۔ اس تمہید کے بعض پہلوؤں پر نگاہ ڈالیے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا آغاز اعترافِ شکر سے ہوا ہے۔ شکر کا حقیقی سزاوار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ٹھہرایا گیا ہے اور یہ شکر ہی وہ چیز ہے جس سے بندہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مستحق قرار پاتا ہے اور جتنا ہی اس میں ترقی کرتا جاتا ہے اسی حساب سے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے چنانچہ فرمایا ہے:

نِعۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا ۔ كَذٰلِكَ نَجۡزِيۡ مَنۡ شَكَرَ (۳۵۔ قمر)	یہ ہماری طرف سے فضل ہوا اور ایسا ہی ہم بدلہ دیتے ہیں ان لوگوں کو جو ہمارے شکر گزار رہتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ (۷۔ ابراهیم)	اگر تم میرے شکر گزار رہو گے تو میں تمہارے لیے اپنی نعمتوں میں اضافہ کرتا رہوں گا۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی جن صفتوں کے توسّل سے یہ دعا کی گئی ہے وہ دوسری تمام صفات کے لیے بمنزلہ بنیاد کے ہیں۔ اس وجہ سے اس دعا میں گویا اللہ تعالےٰ کے سارے ہی اسمائے حسنیٰ کا سہارا حاصل کر لیا گیا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ میں کامل سپردگی اور کامل حوالگی کا اظہار ہے۔ بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے دروازے پر ڈال دیتا ہے۔ اس دروازے کے سوا اس کے لیے اور کوئی دروازہ نہیں۔ بس ایک ہی ہے جس کی وہ بندگی کرتا ہے اور ایک ہی ہے جس سے وہ مدد کی درخواست کرتا ہے۔ جب اس طرح ساری دنیا سے کٹ کر بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دے گا تو آخر اس کی دعا کا ایک ایک حرف کیوں نہ شرفِ قبولیت پائے گا۔

اس دعا کے خاتمہ پر بھی غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ وہ بھی اس کی قبولیت کے لیے ایک بہترین سفارش فراہم کرتا ہے۔ یہاں جس صراطِ مستقیم کی ہدایت کی دعا کی گئی ہے، اول تو اس کے لیے جو اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے وہی اس مطلوب کے لیے بندے کے ذوق و شوق کا پورا پورا اظہار کر رہا ہے کیونکہ اِھْدِنَا کا مفہوم، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، صرف اسی قدر نہیں ہے کہ ہمیں سیدھا رستہ بتا دے۔ بلکہ یہ بات بھی اس اسلوب میں چھپی ہوئی ہے کہ اس رستہ کے لیے ہماری آنکھیں کھول دے، اس پر چلنے کا ہمیں شوق اور ولولہ عطا فرما، ہمارے دلوں میں اس کی محبت جاگزیں کر دے اور اسی پر ہمیں چلنے کی توفیق دے اور اسی پر مرنے کی سعادت نصیب کر۔ ثانیاً اس کی مزید وضاحت ایسے الفاظ سے کی گئی ہے جن سے ان لوگوں کے ساتھ بندے کی محبت کا اظہار ہوتا ہے جو اسی رستے پر جیے اور مرے ہیں اور ان لوگوں سے انتہائی بیزاری کا اظہار ہے جنھوں نے شرارت یا حماقت کے سبب سے اس سے انحراف اختیار کیا ہے۔

اس دعا کی بے شمار بلاغتوں میں سے یہ چند ہیں جن کی طرف اجمالی طور پر ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اس سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ دعا نماز کی مخصوص دعا کیوں قرار دی گئی۔ اور کیوں یہ بات ہے کہ زبان سے نکلتے ہی اس کا لفظ لفظ شرفِ قبولیت حاصل کرتا ہے۔ ایک طرف دعا کے ان الفاظ کو سامنے رکھیے اور دوسری طرف نماز کی مخصوص ہیئت اور اس کے مخصوص آداب کو ملحوظ رکھیے پھر تصور کیجیے کہ کتنی بہترین دعا ہے اور اس کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے کتنا بہترین طریقہ ہمیں سکھایا ہے۔

۵۔ سورہ پر دیباچۂ قرآن ہونے کی حیثیت سے ایک نظر

قرآنی مطالب کے تین بنیادی عنوان

اس سورہ کو قرآن مجید کی ترتیب میں بھی دیباچۂ قرآن کی جگہ دی گئی ہے اور حدیثوں میں بھی اس کے جو مختلف نام آئے ہیں ان سے بھی اس کی یہی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً اس کو فاتحۃ الکتاب کہا گیا ہے جس کے صاف معنی دیباچۂ قرآن کے ہیں۔ اسی طرح اس کے لیے ام الکتاب یعنی مغزِ قرآن کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، جو پہلے لفظ سے بھی زیادہ اس کی اہمیت کو واضح کرنے والا ہے۔ کافیہ اور مُوَقِّیہ بھی اس کے نام ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سورہ اپنے اندر تمام قرآنی مطالب کو سمیٹے ہوئے ہے۔ مختصراً ہم سورہ کے اس پہلو پر بھی کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک تین وجوہ سے اس سورہ کو دیباچۂ قرآن ہونے کا مرتبہ حاصل ہوا ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس سورہ میں دین اور شریعت کے نقطۂ آغاز کا پتہ دیا گیا ہے۔ یہ سورہ ہمیں بتاتی ہے کہ خدا پرستی کا اولین محرک کیا ہے۔ یہ محرک کن عوامل کا نتیجہ ہے۔ اس تحریک سے انسان خدا پرستی کی راہ میں پہلا قدم

کیا اٹھاتا ہے اور اس قدم کے بعد اس کے اندر اصل طلب و جستجو کس چیز کے لیے پیدا ہوتی ہے۔

ہر شخص یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ جس سورہ میں مذکورہ سوالوں کا جواب دیا گیا ہو وہی سورہ اپنے مضمون کے لحاظ سے دیباچۂ قرآن کی جگہ پانے کے لیے موزوں ترین سورہ ہے۔

اب آیئے ان اشارات کی روشنی میں، جو اوپر گزر چکے ہیں، یہ دیکھیے کہ یہ سورہ ان سوالوں کا کیا جواب دیتی ہے۔

یہ سورہ بتاتی ہے کہ آفاق اور انفس کے اندر خدا کی ربوبیت، اس کی رحمانیت اور رحیمیت اور اس کے عدل کی جو نشانیاں موجود ہیں وہ انسان کے اندر خدا کے شکر کا جذبہ ابھارتی ہیں۔ یہ جذبہ ایک زوردار محرک بن کر انسان کو خدا کی عبادت اور اسی سے استعانت کے لیے اُکساتا ہے۔ اس کے بعد انسان میں اس سیدھے رستہ کی طلب و جستجو پیدا ہوتی ہے جو اس کو خدا تک پہنچائے۔ انسان کی اس طلب و جستجو کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالےٰ نے نبوت اور رسالت کا نظام قائم فرمایا اور اپنی ہدایت و شریعت نازل فرمائی۔ مذہب کی راہ میں انسان کا فطری ارتقا اسی طرح ہوا ہے اور اس سورہ میں یہ حقیقت چونکہ نہایت اجمال اور نہایت خوبی کے ساتھ واضح ہوئی ہے اس وجہ سے اس کو دیباچۂ قرآن کی جگہ ملی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن میں جو مطالب بیان ہوتے ہیں اگر ان کو سمیٹا جائے تو وہ تین عنوانوں کے تحت جمع کیے جا سکتے ہیں۔ توحید، قیامت، رسالت۔ یہ سورہ ان تینوں عنوانوں پر بنیادی رہنمائی دیتی ہے۔ اس وجہ سے اس نے گویا قرآن کے سارے علوم کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اس کی ابتدائی دو آیتوں میں خدا ہی کا تمام عالم کا مالک اور آقا ہونا اور تمام حمد و شکر کا سزاوار ہونا بیان ہوا ہے۔ اس کی تیسری آیت میں ایک روزِ جزا و سزا کی آمد کی طرف بھی اشارہ ہے اور ساتھ ہی اس میں توحید کا مضمون بھی شامل ہے کہ اس دن اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کا بھی کوئی زور اور اختیار نہیں چلے گا۔ اس کی چوتھی آیت میں بندہ اپنے آپ کو بالکل اپنے رب کے حوالے کر دیتا ہے اور یہی توحید کی اصلی حقیقت ہے۔ پانچویں آیت میں اصل دعا ہے اور اس دعا ہی سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ انسان اللہ کی سیدھی راہ معلوم کرنے کے لیے نبوت و رسالت کے سلسلہ اور اس کی نازل کردہ ہدایت و شریعت کا محتاج ہے۔ نیز اسی لپیٹ میں یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہے کہ خدائی شریعت پانے کے بعد کسی قوم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور اس کی قدر کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالےٰ کیا معاملہ کرتا ہے۔ غرض اس سورہ کے اندر دین کے تمام بنیادی عناصر جمع ہیں۔ اگر ان کی تفصیل کر دی جائے تو دین کا پورا نظام کھڑا ہو جائے۔ گویا ان چند آیتوں کے اندر پورا قرآنِ عظیم بند ہے اور اس چھوٹے سے نگینہ کے اندر معانی و حقائق کا وہ پورا شہرستان دکھا دیا گیا ہے جو قرآن کے تیس پاروں کے اندر پھیلا ہوا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے باطن کی یہی پیاس، جو اس سورہ سے ظاہر ہو رہی ہے، درحقیقت نزولِ قرآن کا سبب بنی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس امت سے پہلے یہود اور نصاریٰ کو صراطِ مستقیم دکھائی تاکہ وہ خود بھی اس پر چلیں اور دوسروں کو بھی اس پر چلنے کی دعوت دیں لیکن وہ اس راہ پر نہ خود قائم رہے اور نہ دوسروں کے لیے

انھوں نے اس کے نشانات باقی رہنے دیئے۔ اس راہِ حق کو گم کر کے انھوں نے دنیا کو جاہلیت کے اندھیرے میں ڈال دیا تھا۔ یہ سورہ اسی اندھیرے سے نکلنے کی دعا ہے اور ایک ایسی دعا ہے جو فطرتِ انسانی کی گہرائیوں سے نکل رہی ہے۔ یہی دعا ہے جس کی برکت سے دنیا کو قرآن کی روشنی ملی اور جاہلیت کی تاریکی سے نکلنا نصیب ہؤا۔ اور یہی دعا ہے جو قرآن کے فہم و تدبر اور اس سے زندگی کے مسائل میں رہنمائی حاصل کرنے کے معاملہ میں بھی ہمارے قدم کو جادۂ مستقیم پر استوار رکھ سکتی ہے۔ اس پہلو سے بھی یہ سورہ دیباچۂ قرآن بننے کے لیے نہایت موزوں تھی۔

۔ سورہ کا تعلق بعد کی سورہ سے

پورے قرآن سے اس سورہ کا جو تعلق ہے وہ اوپر کی بحث سے اچھی طرح واضح ہو چکا ہے۔ اب ہم اس کا تعلق بعد کی سورہ (سورۂ بقرہ) سے واضح کرنا چاہتے ہیں۔

سورۂ فاتحہ کے آخری حصہ اور سورۂ بقرہ کی پہلی آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں سورتوں میں وہی تعلق ہے جو تعلق ایک دعا اور اس کے جواب یا ایک دعا اور اس کے اثر اور اس کی قبولیت میں ہوتا ہے۔ سورۂ فاتحہ کا خاتمہ ان الفاظ پر ہؤا ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ (ہمیں سیدھے رستہ کی ہدایت دے، ان لوگوں کے رستہ کی جن پر تو نے انعام کیا، جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ) اس کے معًا بعد سورۂ بقرہ اس طرح سورہ شروع ہوتی ہے۔ الٓمّٓ. ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝ (الٓمّٓ۔ یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ خدا ترسوں کے لیے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے) گویا سورۂ فاتحہ میں جس آسمانی ہدایت و رہنمائی کے لیے دعا کی گئی تھی، سورہ بقرہ میں وہ ہدایت سامنے آگئی۔ ایک صاحبِ ذوق جب دعا کے فوراً بعد اس کے اس اثر اور نتیجہ کو سامنے موجود دیکھتا ہے تو اس کی روح خدا کے شکر کے جذبہ سے سرشار ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور پہلو بھی سامنے رکھنا چاہیئے، وہ یہ کہ سورۂ فاتحہ میں منعم علیہم گروہ کے رستہ کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ مغضوب اور گمراہ گروہوں کے طریقوں سے بچائے جانے کی بھی دعا ہے۔ دعا کے اس پہلو کو سامنے رکھ کر جب آدمی سورۂ بقرہ کی تلاوت کرتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس سورہ میں ملتِ ابراہیمی کی تجدید کے ساتھ ساتھ یہود کے ان تمام جرائم کی فہرست بھی بیان ہوئی ہے جو انہوں نے خدا، اس کے نبیوں اور رسولوں اور اس کی شریعت کے خلاف کیے ہیں اور جن کے سبب سے وہ اس بات کے مستحق ٹھہرے کہ ان پر خدا کا غضب نازل ہوا اور وہ قوموں کی امامت کے منصب سے معزول کیے جائیں۔ گویا سورۂ فاتحہ میں جس انعام یافتہ اور اس کے بالمقابل جس مغضوب گروہ کی طرف ایک اجمالی اشارہ تھا سورۂ بقرہ میں ان دونوں گروہوں سے متعلق پوری تفصیل سامنے آگئی اور واضح ہو گیا کہ کن کی پیروی کرنی ہے اور کن کے طریقوں سے بچنا ہے۔

بالکل یہی صورت سورہ آل عمران کی ہے جو سورۂ بقرہ کے بعد ہے۔ بقرہ میں جس طرح یہود کی شرارتوں کی

تفصیل ہے اسی طرح آل عمران میں نصاریٰ کی بدعتوں اور ان کی گمراہیوں کی تردید کی گئی ہے اور ساتھ ہی اس میں اس اسلام کی صحیح تصویر بھی پیش کی گئی ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیائے کرام بالخصوص حضرت مسیح علیہ السلام نے دی ہے۔ سورۂ فاتحہ کے بعد ترتیب قرآن میں انہی دو بڑی سورتوں کا جگہ پانا اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہ بعد کی دونوں سورتیں سورۂ فاتحہ کی دعا کی مقبولیت اور اس کے آخری حصہ کے اجمالات کی شرح ہیں۔